(غلام گردش)

باؤنذیر، انسانی نفسیات کا پروفیسر ہے!

جب پاکستان وجود میں آیا، تو میری عمر صرف تیرہ برس کی تھی۔ ہم لوگ، مسلمانوں کی ایک بستی میں رہتے تھے۔ حالات بالکل درمیانے سے تھے۔ سفید پوشی اور غربت کے درمیان میں معلق زندگی۔ جالندھر میں موجود اس بستی میں کچھ ہندو خاندان بھی رہتے تھے۔ اندازہ ہی نہیں تھا کہ پاکستان نام کا کوئی ملک بن جائیگا اور ہم لوگوں کو جالندھر سے لاہور آنا پڑیگا۔ گھر کے حالات یہ تھے، کہ اس میں نہانے کا منظّم انتظام تک نہیں تھا۔ بستی میں موجود، ایک کنواں پر جا کر نہاتا تھا۔ زندگی بس ایسے ہی گزر رہی تھی۔ اچانک اعلان ہوا کہ جالندھر تو ہندوستان کا حصہ ہے۔ ہر طرف بلوے شروع ہو گئے۔ قتل و غارت، لوٹ مار، بربادی، ہر دوسرے گھر کا مقدر بن گئی۔ ایک ہندو، ہمارے خاندان کیلئے فرشتہ ثابت ہوا اور اسکی وجہ سے ہم لوگ زندہ بچ گئے۔ باؤنذیر کی آنکھوں میں ماضی کے سائے، یادوں کے پر لگائے رقص کر رہے تھے۔ میں بالکل خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

باؤنذیر بات کرتا رہا اور میں سنتا رہا۔ جب سٹیشن پر ٹرین آئی تو معلوم ہوا کہ یہ لاہور ہے اور پاکستان میں ہے۔ باہر نکلے تو جیب میں ایک آنہ تک نہیں تھا۔ جو کپڑے پہن رکھے تھے، صرف وہی سب کچھ تھا۔ لاہور سٹیشن کے سامنے ایک مسافر خانہ تھا۔ پورا خاندان اس مسافر خانے میں طویل عرصے تک رہائش پذیر رہا۔ فرش پر سوتے تھے اور کپڑے بدلنے کی استطاعت نہیں تھی۔ اس قدر بے بسی تھی کہ بتا نہیں سکتا۔ اکثر دوست کہتے ہیں کہ باؤنذیر، تم اپنی غربت کا کیوں ذکر کرتے ہو۔ میرا جواب ہے کہ اپنے ماضی کو چھپانا گناہ سمجھتا ہوں۔ اچانک میرے ذہن میں پچیس برس پہلے کا ایک خاکہ سا آیا۔ اس وقت میں ایل ڈی اے میں ڈائریکٹر پوسٹ ہوا تھا۔ پتہ نہیں کہ قرعہ فال میرے نام پر کیسے نکلا۔ بہر حال، بہاولپور سے سیدھا لاہور آ گیا۔ سرکاری نوکری کا اعجاز دیکھیے، کہ پورے لاہور کے بڑے لوگ، اس وقت ایل ڈی اے میں چٹیں دیکر دفتروں کے باہر گھنٹوں انتظار کرتے تھے۔ اپنی عادت سے مجبور، ہر ایک سے فوراً ملتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اسکا کام ہو جائے۔ عملی طور پر لاہور کے پراپرٹی کے جنات کا کوئی علم نہیں تھا۔ ایک دن دفتر میں، سفید کُرتے شلوار میں ملبوس ایک شخص آیا۔ آواز میں تندی تھی اور ہاتھ میں ایک بڑا سا بکسہ تھا۔ دراصل یہ موبائل کی ابتدائی قسم تھی۔ لاہور میں اس وقت بہت کم موبائل ہوا کرتے تھے۔ میرا نام باؤنذیر ہے اور فیصل آباد سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس شخص کی بے تکلفی دیکھ کر حیران ہو گیا۔ دو تین ملاقاتیں ہوئیں۔ دراصل اسے، ڈی جی ایل ڈی اے، چوہدری امین اللہ مرحوم سے کام تھا۔ پتہ نہیں کام ہوا کہ نہیں۔ مجھے بالکل یاد نہیں ہے۔ حالیہ ملاقات میں نذیر کو کہا کہ آپ پچیس برس پہلے دفتر آئے تھے۔ باؤنذیر نے سر ہلایا اور تین دہائیاں پہلے کی ساری گفتگو سنا دی۔ اسکی یادداشت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسکے بعد میری، اس شخص سے دو دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ اس وقت باؤنذیر کی عمر اَسی برس سے اوپر ہے۔ اصل عمر کا صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس عمر میں بھی باؤنذیر مکمل طور پر فعال ہے اور اپنے کاروبار کو کامیابی سے دیکھ رہا ہے۔

خیر، باؤنذیر، اپنی زندگی کی کہانی سنا رہا تھا اور میں مکمل توجہ سے بات سن رہا تھا۔ مسافر خانے سے ہم لوگ لائل پور آ گئے۔ وہاں گھنٹی چوک پر سپیئر پارٹس کی دکان پر پچھتر روپے ماہوار پر نوکری کر لی۔ محنت کی اور مالکان کی نظر میں آ گیا۔ مجھ پر حد درجہ اعتماد کرنے لگے۔ اس

دکان پر، میرے پاس ایک اجنبی شخص آیا۔ وہ بھی میرا ہم نام تھا۔ کہنے لگا کہ آپ مجھے کچھ سپیئر پارٹس دے دیں۔ میرے پاس سرمایہ نہیں ہے۔ لاری اڈہ میں ایک دکان ہے۔ سامان بیچ کر آپکو پیسے دے دیا کرونگا۔ میں نے بات مان لی۔ کام کا سلسلہ چل پڑا۔ یہ شخص دیکھتے ہی دیکھتے، فیصل آباد کا اہم ترین ٹرانسپوٹر بن گیا اور دولت اسکی غلام بن گئی۔ چوہدری نذیر، فیصل آباد میں کوہستان بس سروس کا مالک بنا اور سیاست میں بھی کامیاب رہا۔ باؤ نذیر، اس شخص کو کامیاب بننے میں حد درجہ معاون رہا۔ چند ایسی ذاتی باتیں ہیں جو میں لکھ نہیں سکتا۔ بعد میں متعدد وجوہات کی بدولت دونوں ہم نام، ایک دوسرے سے اُکھڑ گئے۔ سلسلہ مقدمے بازی، پرچوں اور ذاتی عداوت کی ایک محیر العقول داستان ہے۔ باؤ نذیر اپنا دل کھول کر مجھ سے بات کر رہا تھا۔

کہنے لگا، آپ تو بچے ہیں۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پرانا پاکستان بالکل مختلف تھا۔ آج کا فیصل آباد، اس وقت کا لائل پور حد درجہ بہترین شہر تھا۔ باؤ نذیر نے نوکری چھوڑ کر ٹرانسپورٹ کا چھوٹا سا کام شروع کر لیا اور آہستہ آہستہ قسمت کی دیوی اس پر بھی مہربان ہوتی گئی۔ کاروبار میں کامیابی کی بدولت روپے پیسے کی ریل پیل ہوگئی۔ افسران اور اہم لوگوں سے تعلق بنتے چلے گئے۔ لائل پور میں عدلیہ اور انتظامیہ کے لوگ دم بھرنے لگے۔ دو کاریں خریدیں، جو افسران کو استعمال کیلئے وقتاً فوقتاً دیتا رہتا تھا۔ ویسے یہ چالیس برس پہلے، عام سی بات تھی۔ بہرحال متعدد وجوہات کی بدولت، فیصل آباد سے لاہور آ گیا۔ ایک دن، چند دوستوں نے آنا تھا۔ لاہور میں واحد چائنیز ریسٹورنٹ میں فون کر کے ٹیبل مختص کروانے کی کوشش کی۔ صرف ایک ہی چینی ریسٹورنٹ تھا اور اسکے مالک کا نام سٹیو تھا۔ سٹیو نے پوچھا کہ مہمان کون ہیں۔ اسے بتایا کہ سینئر افسران ہیں۔ کوئی ڈی سی ہے، کوئی ایس پی ہے۔ سٹیو نے قہقہہ لگایا اور کہا کیا تم انکو سینئر افسران کہتے ہو۔ آج میرا پورا ریسٹورنٹ بُک ہے۔ کوئی ٹیبل نہیں مل سکتی۔ اَز حد ندامت ہوئی۔ وقت گزر گیا۔ اپنا چائنیز ریسٹورنٹ کھولنے کا فیصلہ کیا۔ مصیبت یہ تھی کہ پورے شہر میں ایک بھی چائنیز شیف نہیں تھا۔ فوراً ہانگ کانگ گیا اور وہاں سے دو شیف لیکر آیا۔ لاہور میں، مقامی چائنیز کھانے شروع کرنے کا کام میں نے شروع کیا۔ باؤ نذیر، پتہ نہیں کیوں، مجھے سب کچھ کیوں بتا رہا تھا۔ شائد کوئی غم، کوئی دکھ، تھا۔ میرے پوچھنے پر آرام سے کہا، کہ میرے پانچ بیٹے ہیں۔ ہر بچہ اپنی زندگی میں کامیاب ہے۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ گفتگو جاری رہی۔ پوچھا کہ جنرل رانی کا نام سنا ہے۔ اثبات کے جواب پر باؤ نذیر نے حیران کن بات کی۔ عجیب سے لہجے میں کہا کہ وہ ایک عظیم عورت تھی۔ میرے لیے یہ بات حیران کن تھی کیونکہ جنرل یحییٰ سے انکے تعلقات ہر خاص و عام کے علم میں ہیں۔ باؤ کہنے لگا، جنرل رانی کے پاس بہت لوگ جاتے تھے کہ آپ ملک کی اہم ترین شخصیت کی قربت میں ہیں۔ ہمارا فلاں کام پھنسا ہوا ہے۔ خدارا، کروا لیجئے۔ آپ جتنے پیسے کہیں گی، ہم دینے کیلئے تیار ہیں۔ جنرل رانی کا کمال یہ تھا کہ وہ کسی کام کے پیسے نہیں لیتی تھی۔ فائل اپنے پاس رکھ لیتی تھی۔ کام کروانے کے بعد خاموش ہو جاتی تھی۔ پھر موقع محل دیکھ کر بڑی تہذیب سے ''مٹھائی'' طلب کرتی تھی۔ غریبوں اور مفلسوں کے کام تو ویسے ہی کروا دیتی تھیں۔ باؤ نذیر کی یہ بات سن کر میں سوچنے لگا کہ خدا، اپنے ہر بندے اور بندی سے کام لیتا ہے۔ قدرت کے کارخانے میں کون سھپل ہے، یہ صرف وہی جانتا ہے۔ لوگوں کو کسی کی برائی اور اچھائی پر فیصلہ دینے کا اختیار نہیں ہے۔ یہ خدائی کام ہے۔

ہاں، باؤ نذیر نے ایک بہت عجیب بات بتائی۔ستر کی دہائی میں، ملک کے وزیراعظم پنجاب کے گورنر سے ناراض ہوگئے۔کسی کا نام نہیں لکھ رہا۔وزیراعظم نے لوگوں سے پچھوایا کہ اسکا کام تمام کون کریگا۔کئی لوگوں کے انٹرویو کیے گئے۔قرعہ فال، فیصل آباد ہی کے ایک طاقتور آدمی کے نام نکلا۔اس نے وزیراعظم کو بتایا کہ میں گورنر کے اردگرد تمام لوگوں کو خرید چکا ہوں۔لہذا میں واحد آدمی ہوں، جو صوبے کے گورنر کو قتل کرسکتا ہے۔ہاں، ہونے پر، کھڑیانوالہ کے نزدیک گورنر کی گاڑی پر بس چڑھانے کی کوشش کی گئی۔مگر خدا کی قدرت کہ گورنر بچ گیا۔اسکے بعد گورنر نے فیصل آباد کیا، پورے صوبے میں جرائم پیشہ لوگوں کو مکمل ختم کر ڈالا۔بدمعاشی اور رسہ گیر، اسکے نام سے کانپتے تھے۔جزئیات میں نہیں جانا چاہتا۔کیونکہ یہ باؤ نذیر کا بیانیہ ہے۔اس ڈرامہ کے اکثر کردار اب دنیا میں نہیں ہیں۔لہذا میں محتاط لفظوں میں اس واقعہ کو بیان کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔

پولیس کے متعلق باؤ نذیر نے ایک منفرد بات کی۔دراصل ثابت کرنا چاہتا تھا کہ شہرت اور اصلیت میں اکثر اوقات زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔نواب امیر محمد خان گورنر تھا۔اس نے ساہیوال سے ایک بہت اچھے گھر کے نوجوان کو اے۔ایس۔آئی بھرتی کیا۔پرانے لوگوں کو اندازہ ہے کہ چالیس پچاس برس پہلے پولیس کتنی بہتر تھی۔اے ایس آئی، ذاتی کار میں لائل پور آیا۔وہاں اسکی شہرت ایک انتہائی ایماندار افسر کی تھی۔باؤ نذیر سے اسکی دوستی ہوگئی اور بے تکلفی بھی۔اے ایس آئی ترقی کرتا کرتا انسپکٹر بنا اور پھر نوکری سے استعفیٰ دیدیا۔ایک دن، باؤ قدیر نے پوچھا کہ آپ اتنے ایماندار کیسے ہیں۔پولیس والے کا جواب حد درجہ متاثر کن تھا۔کہنے لگا باؤ، میں سال میں صرف دو تین کیسوں میں پیسے لیتا ہوں۔باقی پورا سال میں کسی سے پانی کا گلاس تک نہیں پیتا۔میری شہرت صرف اسلیے اچھی ہے کہ میں ہر جگہ مونہہ کالا نہیں کرتا۔باؤ نذیر کہنے لگا، کہ پاکستان میں سو فیصد ایماندار کوئی بھی نہیں ہے۔پیسے لینے کے اور فوائد حاصل کرنے کے اپنے اپنے طریقے ہیں۔ذہین افسران اور اہلکاران ایمانداری کے اس کلیے پر عمل کرتے ہیں کہ ہر جگہ مونہہ کالا نہیں کروانا، ہر ایک سے پیسے نہیں لینے۔وہ سال میں ایک آدھے کیس میں تگڑے پیسے لے لیتے ہیں اور پھر ایمانداری کا ڈھول پیٹنا شروع کردیتے ہیں۔باؤ کی اس بات میں مجھے حد درجہ وزن نظر آیا۔واقعی، یہ بات حقیقت پر مبنی تھی۔

باؤ نذیر عدلیہ، انتظامیہ اور سیاستدانوں کے متعلق تجربات اور تجزیہ کا ایک نادر ذخیرہ ہے۔ہاں، ایک بات، اس سے پہلے کہ بھول جاؤں۔کہنے لگا کہ ایسے بھی ہوا کہ ہائیکورٹ کے جج ملزم کو اپنی کار کی ڈگی میں عدالت لیکر گئے ہیں اور وہاں ضمانت کروائی ہے۔کیونکہ انتظامیہ، اس ملزم کو ہائیکورٹ میں جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔باتیں ہوتی رہیں۔حمید سیٹھی کا ذکر، باؤ نے بڑے احترام سے کیا۔سیٹھی صاحب سے میری بھی شناسائی ہے۔حد درجہ، انسان دوست آدمی ہیں۔اب اس طرح کے افسر معدوم ہوچکے ہیں۔ویسے سیٹھی صاحب ماشاءاللہ، کالم بھی لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔باؤ سے ایک سوال کیا، کہ باؤ، جو شخص، پچیس سال پہلے میرے دفتر آیا تھا اور آج میرے سامنے باتیں کررہا ہے۔وہ تو ماضی سے بالکل بدل چکا ہے۔دونوں میں کوئی بھی مماثلت نہیں ہے۔باؤ نذیر نے کہا، کہ ڈاکٹر آپ ٹھیک کہہ رہے ہو۔میں واقعی ماضی کا باؤ نہیں ہوں۔واپسی پر، میں سوچ رہا تھا کہ کیا سرکاری اکابرین کو باؤ نذیر اور اس جیسے لوگوں کے تجربات سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہیے۔میرا خیال ہے کہ اَن پڑھ ہونے کے باوجود، باؤ، ہارورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ لوگوں سے زیادہ

سیانا ہے۔ہمیں لائق نہیں، باؤنذیر جیسے سیانے لوگ چاہییں ۔میری نظر میں وہ انسانی نفسیات کا ایک کامیاب پروفیسر ہے!

راؤ منظر حیات